چنانچہ اسی شعر و شاعری کے ذوقِ عام نے، ادبی گروہ بندی، اور مشاعرے کی رسم کے وسیع رواج نے تذکرہ نگاری کے فن اور مشغلے کو بہت تقویت دی۔ چنانچہ ایک صدی کے اندر بے شمار تذکرے معرضِ تحریر میں آ گئے۔ بیاض نویسی بھی تذکرے کی طرح ایک مقبول عام شغل تھا جو لوگ عمدہ تذکرے نہ لکھ سکتے تھے وہ اپنے ذوق کی تشفی کے لئے بیاض ضرور بنا لیتے تھے جس میں اپنی پسند کے اشعار اور غزلیں شاعر کے نام اور مختصر حالات کی قید سے جمع کر لیتے تھے۔ لیکن بیاض کے لئے کوئی خاص ترتیب نہیں ہوتی تھی جس طرح جامع اور مرتب نے پسند کیا مرتب کر لیا شعراء کے کلام کا انتخاب بھی ایک دلپسند چیز تھی بہت سے صاحبانِ ذوق قدیم و جدید شعراء کے کلام کا عمدہ انتخاب ایک خاص ترتیب کے ماتحت جمع کر لیا کرتے تھے جس کے ساتھ نہایت مختصر حالات شعراء کے دے دیتے جاتے تھے۔ مگر بعض اوقات صرف نام دے دیا جاتا تھا۔[1]

غرض یہ کہ اس طرح اردو تذکرہ نویسی کی بنیاد پڑی۔ ظاہر ہے کہ یہ تذکرے لکھنے والے زیادہ تر خود اپنے لئے لکھتے تھے اپنی دلچسپی کے لئے لکھتے تھے۔ اپنے ذوق کی تسکین کے لئے لکھتے تھے۔ اس لئے ان کے اندر سختی سے کسی ایسی چیز کو تلاش کرنا جو ادبی، فنی یا تنقیدی نقطۂ نظر سے مکمل ہو مناسب نہیں معلوم ہوتا۔ دیکھنا تو یہ ہے کہ انفرادی، ذاتی اور شخصی حیثیت کے حاصل ہونے کے باوجود کس حد تک ان میں غیر شعوری طور پر وہ عناصر پیدا ہو گئے ہیں۔ جن کو ادبی، فنی یا تنقیدی اہمیت حاصل ہے۔

اردو شاعروں کے بہت سے تذکرے لکھے گئے ہیں۔ ان میں میر تقی میر کا نکات الشعراء، میر حسن کا تذکرہ شعرائے اردو۔ مصحفی کا تذکرۂ ہندی۔ اور ریاض الفصحاء

---

[1] ڈاکٹر عبداللہ: شعرائے اردو کے تذکرے: مطبوعہ اردو اپریل ۱۹۴۲ء ص ۱۵۸

کا مخزنِ نکات - میرزا علی لطف کا گلشنِ ہند - گردیزی کا تذکرۂ ریختہ گویاں - قدرت اللہ خاں قاسم کا مجموعہ نغز - لچھمی نرائن شفیق کا چمنستان شعرار - تمنا اورنگ آبادی کا گل عجائب مصطفےٰ خاں شیفتہ کا گلشنِ بے خار اور کریم الدین کا طبقات الشعرار، مرزا قادر بخش صابر کا گلستان سخن اور لالہ سری رام کا خمخانۂ جاوید، خاص طور پر قابل ذکر ہیں - ان سب تذکروں پر مفصل بحث سے کوئی نتیجہ نہیں اس لیئے صرف چند کو سامنے رکھ کر تذکروں کی تنقیدی اہمیت کا پتہ لگایا جائے گا -

عام طور پر ان تذکروں میں تین چیزیں پائی جاتی ہیں - ایک تو شاعر کے مختصر حالات دوسرے اس کے کلام پر مختصر سا تبصرہ اور تیسرے اس کے کلام کا انتخاب! اردو تذکروں میں بعض ایسے بھی ہیں جو کسی خاص نقطۂ نظر، کسی خاص حلقے کی ترجمانی اور کسی خاص مصلحت کے پیش نظر لکھے گئے ہیں ایسے تذکروں کی صداقت اور خلوص پر بھروسہ نہیں کیا جا سکتا - کیونکہ لکھنے والے نے ان کو خالص ادبی نقطۂ نظر سے نہیں لکھا اس لئے ان کے اندر جانبداری اور نفرت کے عناصر ملتے ہیں - ہمارے مقصد کے لئے ایسے تذکرے کام کے نہیں - اس لئے ان کا نظر انداز کر دینا ہی بہتر ہے - ہم تو ایسے تذکروں پر نظر ڈالنی چاہتے ہیں جو بڑی حد تک خلوصِ نیت، دیانتداری اور صداقت کے حامل ہوں - اس لئے ان کا بیان کرنے سے قبل اور ان کا تنقیدی تجزیہ کرنے سے پہلے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ تذکروں کی تقسیم پیش کر دی جائے - ڈاکٹر سید عبداللہ نے اپنے مقالے "شعرائے اردو کے تذکرے" میں ان تذکروں کی جو تقسیم پیش کی ہے وہ نہایت ہی مناسب ہے وہ ان تذکروں کو باعتبار خصوصیات سات قسموں میں تقسیم کرتے ہیں :-

۱- وہ تذکرے جن میں صرف اعلیٰ شاعروں کے مستند حالات (مع ان کے عمدہ

کلام کے انتخاب کے جمع کئے گئے ہیں۔

۲۔ وہ تذکرے جن میں تمام قابل ذکر شعراء کو جمع کیا گیا ہے اور مصنف کا مقصد جامعیت اور استیعاب ہے۔

۳۔ وہ تذکرے جن کا مقصد تمام شعراء کے کلام کا عمدہ اور مفصل ترین انتخابات پیش کرنا ہے اور حالات کے جمع کرنے کی زیادہ اعتنا نہیں۔

۴۔ وہ تذکرے جن میں اردو شاعری کو مختلف طبقات میں تقسیم کیا گیا ہے اور تذکرہ کا مقصد اس ارتقائی تاریخ کو قلم بند کرنا ہے

۵۔ وہ تذکرے جو ایک مخصوص دور سے بحث کرتے ہیں

۶۔ وہ تذکرے جو کسی وطنی یا ادبی گروہ کے نمایندے ہیں۔

۷۔ وہ تذکرے جن کا مقصد تنقید سخن اور اصلاح سخن ہے[۱]۔

ان تذکروں میں سے اگر وطنی یا ادبی گروہ کے نمایندہ تذکروں کو چھوڑ دیا جائے تو باقی سب کے سب کسی نہ کسی حد تک ہماری مطلب برآری کرتے ہیں۔ ان تذکروں کے ان تینوں پہلوؤں میں، جن پر یہ مشتمل ہوتے ہیں تنقیدی جھلکیاں ملتی ہیں اور تنقیدی رائے قایم کرنے کے لئے مواد دستیاب ہوتا ہے۔

شخصیت اور ماحول کا بیان | تذکروں میں سب سے پہلی چیز حالات کا بیان ہے جس سے شاعر کی شخصیت اور ماحول کا تھوڑا سا اندازہ ہو جاتا ہے ہر چند کہ یہ بیان بہت ہی مختصر ہوتا ہے اور بقول حکیم الدین احمد "شاعر کی پیدائش، اس کا خاندان، اس کی تعلیم و تربیت اس کی زندگی کے مختلف واقعات، اس کی تصنیفات، اس کا

---

[۱] ڈاکٹر عبداللہ: شعرائے اردو کے تذکرے: مطبوعہ اردو اپریل ۱۹۴۲ء صفحہ ۱۵۹-۱۶۰

ماحول، ان میں سے کسی کے متعلق کافی تشفی بخش سامان نہیں ملتا[1] لیکن اس مختصر بیان سے اُس شاعر کی زندگی اور اس کے ماحول کا ایک دھندلا سا خاکہ ضرور آنکھوں کے سامنے آجاتا ہے۔ ہر چند اس کو ہم مکمل نہیں کہہ سکتے لیکن ساتھ ہی یہ حکم بھی لگانے کی ہمت نہیں ہوسکتی کہ یہ بیان بالکل بیکار ہے یا یہ کہ اس کی ضرورت نہیں تھی۔ یا یہ کہ اس کی کچھ بھی اہمیت نہیں۔

تذکرہ نویسوں کے ان بیانات پر نظر ڈالنے سے قبل اس بات کو ذہن نشین کرلینا چاہیے کہ وہ کس وقت، کس ماحول اور کس خیال کے پیش نظر لکھے گئے۔ اگر اسی طرح ان کو دیکھنے کی کوشش کی جائے تو اس میں کچھ نہ کچھ کام کی باتیں ضرور ملیں گی۔

شاعر کے کلام پر تبصرہ اور کلام کے انتخاب کے قبل یہ دھندلا سا خاکہ پیش کردینا بھی ایک اہمیت رکھتا ہے کیونکہ یہ چیز شاعر کی افتادِ طبع، اور ماحول کو سمجھنے میں کسی نہ کسی حد تک ضرور ممد و معاون ثابت ہوتی ہے۔ یہ صحیح ہے کہ "تذکرہ نویسوں میں یہ قدرت نہیں کہ ان واقعات کو اس طرح بیان کریں کہ شاعر کی تصویر میں جان آجائے اور وہ بولنے لگے یہ بھی ٹھیک ہے کہ ان کی اہمیت تاریخی ہوتی ہے۔ ادبی مطلق نہیں۔ خصوصاً ماحول کی کمی سے عقبی زمین ناپید ہوتی ہے"[2] لیکن اگر اس لکھنے والے کے میدان پر نظر ڈال لی جائے تو ان اعتراضات میں ایک ہمدردانہ انداز ضرور پیدا ہوجائے گا۔

ظاہر ہے کہ یہ تذکرہ نویس کسی شاعر پر مکمل تنقیدی مضمون نہیں لکھتے تھے جس کی وجہ سے پس منظر اتنا اجاگر ہوجاتا کہ اس کی حیثیت تاریخی سے ادبی ہوجاتی۔ ان کا مقصد تو صرف اپنے تنقیدی نقطہ نظر کے سہارے اس کے بہترین اشعار کا انتخاب پیش کرنا ہوتا

---

[1] کلیم الدین احمد اردو تنقید پر ایک نظر ص ۱۲ [2] ایضاً

تھا۔ اس لئے اگر انھوں نے شاعر کی زندگی، شخصیت اور اس کے ماحول کی ایک جھلک دکھادی تو یہ بھی بڑا کام ہوا

اب مختلف تذکروں میں پیش کی ہوئی شاعروں کی تصویروں اور ان کے ماحول کے نقشوں کا ذکر ضروری ہے تاکہ ان کی اہمیت ذہن نشین ہو سکے۔

میر تقی میر کا تذکرہ نکات الشعراء اردو کا سب سے اہم قدیم تذکرہ مانا جاتا ہے۔ میر نے اس تذکرے میں مختلف شاعروں کی زندگی کے جو حالات لکھے ہیں اور ان کی سیرت کا جو بیان کیا ہے، ان سے ان شاعروں کی تصویر آنکھوں میں پھر جاتی ہے۔ مثلاً سراج الدین علی خاں آرزو کے بارے میں لکھتے ہیں: "آب و رنگ باغ نکتہ دانی؛ چمن آرائے گلزار معانی، متصرف ملک زور طلب بلاغت، پہلوان شاعر عرصۂ فصاحت، چراغ دودمان صفائی گفتگو کہ چراغش روشن باد، سراج الدین علی خاں آرزو سلمہ اللہ تعالیٰ؛ ابداً شاعر زبردست، قادر سخن، عالم فاضل، تا حال ہمچو ایشاں ہندوستان جنت نشان بہم نرسیدہ بلکہ بحث در امیران می رود، شہرۂ آفاق، در سخن فہمی طاق صاحب تصنیفات دہ بازدہ کتب و رسالہ و دیوان و مثنویات حاصل کمالات اوشاں از حیزہ بیان بیروں است۔ ہمہ استادان مضبوط فن ریختہ ہم شاگردان آں بزرگوار ند۔ گاہے برائے تفنن طبع دو سہ شعر ریختہ فرمودہ این فن بے اعتبار را کہ ما اختیار کردہ ایم اعتبار دادہ اند"[1] اس عبارت سے خان آرزو کی تصویر آنکھوں میں پھر جاتی ہے۔ اور اس ماحول میں ان کی شخصیت کا پوری طرح اندازہ بھی ہو جاتا ہے۔ اسی طرح مظہر جان جاں کے متعلق لکھتے ہیں: "مظہر تخلص مرد بسیت مقدس، مطہر، درویش، عالم، صاحب کمال شہرۂ عالم بے نظیر، معزز، مکرم، اصلش از اکبر آباد است۔ پدر او مرزا جان جاں می گفت

---

[1] میر تقی میر: نکات الشعراء: ص ۳

ازیں سبب ہمیں اسم موسوم است[1]" شاکر ناجی کا تذکرہ ان الفاظ میں کرتے ہیں "جوانے بود آتبہ رو، سپاہی پیشہ، مزاجش بیشتر مائل بہزل بود معاصر میاں آبرو. بندہ بادیک دو ملاقات کردہ بودم۔ شعر ہزل خود میداند و مردماں را بخندہ می آورد، خود نمی خندید مگر گاہے تبسمے می کرد[2]" سودا کی تصویر ان الفاظ میں کھینچی ہے: "جوانیست خوش خلق خوش خوئے گرم جوش، یارباش، شگفتہ روئے، مولدِ او شاہجہاں آباد است، لشکر پیشہ، غزل وقصیدہ ومثنوی وقطعہ ومخمس ورباعی ہمہ را خوب میگوید، سرآمد شعرائے ہندی اوست۔ بسیار خوش گو است[3]" اور میر درد کے متعلق یہ لکھا ہے: "شاعر زور آور ریختہ، درکمال علائقگی وا رستہ، خلیق، متواضع، آشنائے دوست، شعر فارسی ہم می گوید اما بیشتر رباعی، گرمی بازار وسعت مشرب اوست۔ غرض از آشنائی مطلب اوست، متوطن شاہجہاں آباد بزرگ وبزرگ زادہ۔ جوان صالح۔ از درویشی بہرۂ وافی دارد۔ فقیر را بخدمت او بندگی خاص است[4]" غرض یہ کہ اسی طرح اختصار کے ساتھ انھوں نے تمام شاعروں کی سیرت کا نقشہ پیش کیا ہے۔

اگرچہ میر کے پیش کئے ہوئے یہ نقشے مختصر ہیں۔ لیکن اس کے باوجود یہ مکمل معلوم ہوتے ہیں انھوں نے حالات کے بیان کے ساتھ ساتھ ماحول پر بھی روشنی ڈالی ہے اسی وجہ سے ان کی سیرت نگاری میں زیادہ جان پیدا ہوگئی ہے۔ بقول ڈاکٹر عبداللہ:-

"نکات کا شاندار ترین وصف اس کی سیرت نگاری ہے۔ لانگیکر
English Biography 18th century نے Longekar
میں لکھا ہے کہ تذکرۂ رجال میں مصنف کے لئے ضروری ہے کہ وہ اپنے اشخاص

---

[1] میر تقی میر: نکات الشعرا: ص۳ [2] ایضاً [3] ایضاً [4] ایضاً

کی لائف کے واقعات کو ایسے معنی پُر ایجاز و اختصار سے بیان کرے جس سے ان اشخاص کی پوری پوری سیرت آنکھوں میں پھر جائے۔ ایک بیاگرانی اور بیاگرافیکل ڈکشنری میں یہی فرق ہوتا ہے کہ بیاگرانی میں سوانح نگار ایک فرد کی مفصل ترین اور جامع ترین سرگذشت بیان کرتا ہے۔ برعکس اس کے قاموس تراجم (بیاگرافیکل ڈکشنری) میں گنجائش کے کم ہونے کی وجہ سے اختصار سے کام لینا پڑتا ہے

Conciseness is a virtue to which all must be sacrificed.

نکات کی سیرتوں کو اگر اس اصول کی روشنی میں دیکھا جائے تو ہم اس کے اختصار وایجاز میں وہ پُرمعانی و مصوّرانہ دقت نظر پاتے ہیں جو تفصیل میں نہیں مل سکتی۔[1] ایجاز و اختصار کے ساتھ ان شاعروں کی سیرتوں کا بیان، ان کے کلام کی تنقید کے سلسلے میں پس منظر کا کام کرتا ہے۔ اسی وجہ سے وہ اہم ہے۔

سیرت نگاری اور ماحول کی تصویر کشی کی یہ خصوصیات اگرچہ دوسرے تذکروں میں بھی ملتی ہیں لیکن اس سلسلے میں جو مرتبہ نکات الشعرا کو حاصل ہے، وہ کسی اور کو نصیب نہیں۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ دوسرے تذکروں میں یہ خصوصیت بالکل ہی نابید ہے ایسا نہیں ہے۔ دوسرے تذکروں میں بھی یہ خصوصیات ملتی ہیں۔ لیکن طوالت کے خوف سے سب کا ذکر یہاں نہیں کیا جاسکتا۔ اس لئے متقدمین میں سے تذکرہ میر حسن اور متاخرین میں سے گلشن بے خار سے چند مثالوں کا پیش کردینا کافی ہے۔

میر حسن کا تذکرہ اگرچہ بعض حیثیتوں سے بہت اہم ہے اور اس میں شاعروں کی سیرت اور ماحول کے نقشے بھی کھینچے گئے ہیں لیکن وہ مجموعی اعتبار سے میر تک نہیں پہنچتے

۱؎ ڈاکٹر عبداللہ: شعرائے اردو کے تذکرے: مطبوعہ رسالہ "اردو" اپریل ۴۲ء ص ۱۷۱

بقول ڈاکٹر عبداللہ "میر حسن بھی سیرت کی تصویر کشی میں میر کا مقابلہ نہیں کر سکتے بلکہ حقیقی اوصاف کے بیان کرنے کی بجائے مبالغے کی رنگ آمیزی اور سخن طرازی سے کام لیا ہے شاعرانہ پائے کی تعین میں البتہ بہت صائب الرائے ہیں"[1] پھر بھی ان کے بیان میں اس کی بعض اچھی مثالیں ملتی ہیں۔ ان کے بیان میں لفاظی زیادہ ہے لیکن اس کے باوجود ان کی تصویریں زندگی سے بھرپور ہیں، بعض جگہ تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ میر سے بھی آگے بڑھ گئے ہیں کیونکہ ان کے تذکرے میں کسی شاعر سے ان کی بدگمانی کا پتہ نہیں چلتا۔ انھوں نے ہر ایک کے متعلق حالات وواقعات کو پیش کر کے اپنی سچی رائے ظاہر کر دی ہے اور چند کو چھوڑ کر باقی سب کے متعلق ان کی رائیں بڑی حد تک میر کی رایوں سے ملتی جلتی ہیں۔

خان آرزو کے متعلق انھوں نے وہی لکھا ہے جو میر کا خیال ہے لکھتے ہیں۔ "خان مغفرت نشاں، سرگروہ سخن سنجاں، استاد استاداں، ہندوستان جنت نشان چراغ دودمان گفتگو، سراج الدین علی خاں آرزو، بعد امیر خسرو دہلوی چنیں صاحب کمال پرگو و خوش گو بہ مسامع عالمیاں نرسیدہ"[2] میر اثر کے متعلق لکھتے ہیں "از فصحائے نامدار و صلحائے کامگار، خوش اوقات نیک سیر، عرف محمد میر المتخلص بہ اثر، درویشے ست موقر، صاحب سخنے ست موثر، عالم و فاضل، رتبۂ قدرش بہ غایت بلند، گوہر صدرش نہایت ارجمند، برادر خورد خواجہ میر درد دام افضالہ ...... در خدمت برادر بزرگوار خود گوشہ نشینی اختیار کردہ"[3] انشار کے متعلق ان خیالات کا اظہار کرتے ہیں "میر انشاء اللہ خاں از خوبان جہاں و خوش فکران زماں، سخن آگاہ، میر انشاء اللہ طبع تازہ و ذوق بے اندازہ، شراب معانی و ذوق جولانی فرح بخش و مسرت افزا است۔ جوانے ست خوش ظاہر و خوش طبع"[4] میر کی تصویر ان

---

[1] ڈاکٹر عبداللہ: شعرائے اردو کے تذکرے: مطبوعہ رسالہ "اردو" اپریل ۱۹۴۲ء ص ۱۸۷ [2] میر حسن: تذکرۂ شعرائے اردو: ص ۵
[3] ایضاً: ص ۱ [4] ایضاً ص ۱۹

الفاظ میں کھینچے ہیں: "برادرزادۂ سراج الدین علی خاں آرزو، و ہم از شاگردان اوست متوطن اکبر آباد۔ جوان محمد شاہی۔ الحال در شاہجہاں آباد است۔ سن او تقریباً بشصت رسیدہ ...... بسیار صاحب دماغ است و دماغ اورامی زیبد"[1] میر حسن کے ان تمام بیانات سے ان شاعروں کی تصویر آنکھوں میں پھر جاتی ہے۔ ان کے حالات کا پتہ چل جاتا ہے۔ ان کی افتادِ طبع کا اندازہ ہو جاتا ہے اور ان کے مرنے سے بھی آگاہی ہو جاتی ہے اور یہ سب چیزیں مل کر ان کی ادبی حیثیت کو پرکھنے میں مدد دیتی ہیں۔ میر حسن بعض حالات کے پس منظر میں ان پر تنقیدی نظر ڈالتے ہیں جس کا ذکر آگے کیا جائے گا۔ یہ بیانات گو بہت ہی مختصر ہیں لیکن میر کے تذکرے کی طرح اختصار ہی ان کی خوبی ہے۔ مصحفی کے تذکروں کا بھی یہی اندازہ ہے۔

متاخرین کے تذکروں میں جس تذکرے کو بڑی اہمیت حاصل ہے وہ نواب مصطفےٰ خاں شیفتہ کا گلشن بے خار ہے۔ شیفتہ اپنے وقت کے بہت بڑے ادیب اور شاعر تھے ان کی شعر فہمی اور ذوق کی بلندی کے غالب اور حالی تک معترف ہیں۔ انھوں نے بھی شاعروں پر تنقیدی رائے دینے کے ساتھ ساتھ پس منظر کے طور پر ان کی زندگی کے حالات اور سیرت پر بھی روشنی ڈالی ہے جو ان شاعروں کے ادبی مرتبے کو ذہن نشین کرنے اور ان پر تنقیدی نظر ڈالنے میں مدد دیتی ہے۔

دوسرے تذکرہ نویسوں کی طرح شیفتہ کا بھی یہی حال ہے کہ وہ عبارت میں زور پیدا کرنے کے لئے جگہ جگہ رنگینی پیدا کرتے ہیں۔ شاعروں کی سیرت کے بیان میں بھی انھوں نے رنگینی سے کام لیا ہے۔ ان کے بیانات بھی عام طور پر مختصر ہوتے ہیں لیکن بعض بڑے شاعروں

---

[1] میر حسن: تذکرۂ شعرائے اردو۔ صفحہ ۱۵۱-۱۵۲

کے متعلق وہ تفصیل سے بھی کام لیتے ہیں لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ ان کے اختصار میں جامعیت نہیں ہوتی ان کے جملوں ہی سے شخصیت کے تمام پہلو اُجاگر ہو جاتے ہیں مثال کے طور پر آتش کی سیرت کے متعلق صرف چند الفاظ لکھے ہیں لیکن ان سے آتش کی وضع قطع، افتادِ طبع اور ذہنی رجحان کا اندازہ ہو جاتا ہے۔ لکھتے ہیں "از مشاہیر شعرائے لکھنؤ است روش رندانہ و وضع بے باکانہ دارد"[1] اسی طرح انشاء کی تصویر ان الفاظ میں کھینچی ہے "از مقربان خدمت وزیر الممالک نواب سعادت علی خاں بہادر بود لختے در فنون رسمیہ مہارت داشت و در ہر فن کوس لمن الملکی بہ آوازۂ تمام می نواخت۔ بر موزونان معاصر از اعتراضات و مطاعن قافیہ تنگ نمودے"[2] اور جہاں تفصیل سے کام لیتے ہیں وہاں تو شاعر کی زندگی کے تمام پہلوؤں سے آگاہی ہو جاتی ہے۔ صرف ایک مثال کافی ہوگی۔ میر درد کے متعلق لکھا ہے "از طبقۂ صافیہ صوفیہ است۔ و در فضائل صوری و کمالات معنوی وے خارج از حدِ رقم و بیرون از نیروئے قلم است یا رب از وارستگی و انقطاع ایشاں شرح دہد از ورع و تقوے پردازد یا از تزکیۂ باطن و تزکیۂ نفس حرف زند۔ یا از گداختگی و دل برشتگی جگر و دردمندی خاطر بانگوید"[3] ظاہر ہے کہ ان تمام بیانات سے ان شاعروں کی زندگی افتادِ طبع اور دینی رجحانات سے پوری طرح واقفیت ہو جاتی ہے۔

ان تینوں تذکروں پر طائرانہ نظر سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ ان میں حالات اور سیرت کے جو نقشے پیش کئے گئے ہیں وہ اگرچہ مختصر ہیں لیکن بہرحال تنقیدی نظر ڈالنے میں پس منظر کا کام کرتے ہیں۔ اختصار ایک حد تک ان کی خوبی ہے تذکرہ نگاروں کا میدان بہت محدود تھا۔ سیکڑوں شاعروں کے تذکرے میں ایک تذکرہ نگار تفصیل سے نظر نہیں ڈال

---

[1] مصطفیٰ خاں شیفتہ۔ گلشن بے خار: ص ۲ (نولکشور) [2] ایضاً ص ۱۲ [3] ایضاً ص ۲۸

سکتا تھا۔ اور پھر یہ چیز خاص طور پر ان کے پیش نظر بھی نہیں تھی وہ تو کم سے کم جگہ میں کئی پہلوؤں کو پیش کرنا چاہتے تھے اور وہ اس اعتبار سے بہت کامیاب ہیں کہ انھوں نے باوجود محدود میدان کے شاعروں کے تھوڑے بہت حالات بھی بیان کئے ان کی سیرت اور مزاج کی تصویریں بھی کھینچیں۔ اور ساتھ ہی ان کے ادبی کارناموں پر تنقیدی اشارے کئے۔

تنقیدی اشارے | تذکروں میں ان تنقیدی اشاروں کی بڑی اہمیت ہے ان کا تجزیہ کرنے کے بعد پتہ چلتا ہے کہ یہ چار عناصر سے مرکب ہیں

۱۔ شاعروں کے کلام پر رائے۔

۲۔ فارسی شاعروں سے مقابلہ۔

۳۔ کلام پر اصلاح اور

۴۔ اس زمانے کی ادبی تحریکوں پر اشارے۔ اس کے علاوہ بعض تذکرے ایسے بھی ہیں جن میں شعر و شاعری کے متعلق فنی مباحث بھی مل جاتے ہیں۔

۱۔ کلام پر رائے | شاعروں کے کلام پر رائیں عموماً ذوقی اور وجدانی ہوتی ہیں۔ ان میں اس زمانے کے رواج کے مطابق لفاظی کو زیادہ دخل ہوتا ہے۔ عام طور پر اس کی عبارت مقفیٰ اور مسجع ہوتی ہے تذکرہ نگار اپنی ذاتی اور انفرادی رائے کو پیش کرتا ہے اس لئے اس میں کسی اجتماعی نقطۂ نظر کو تلاش کرنا یا کسی ایسی قدر کو ڈھونڈھنا جو دوسرے افراد کے ذوق سے ہم آہنگ ہو سکے بیکار سی بات ہے اس میں لکھنے والا مختلف شاعروں کے کلام کو دیکھ کر اپنے تاثرات کا اظہار کر دیتا ہے لیکن ان تاثرات کے تنقید ہونے سے انکار نہیں کیا جا سکتا البتہ اس سے اختلاف کیا جا سکتا ہے کیونکہ آج بھی جب کہ تنقید میں سیکڑوں نئی نئی شاخیں پھوٹ رہی ہیں تاثراتی تنقید Impressionis tic Critism

کے علم بردار اپنی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد الگ بنائے بیٹھے ہیں۔ ان کے خیال میں اسی قسم کی تنقید صحیح تنقید ہے۔ دوسرے قسم کی تنقید، صحیح معنوں میں تنقید کہے جانے کی مستحق نہیں۔[1]

مجموعی اعتبار سے اگر دیکھا جائے تو میر کے تذکرے نکات الشعراء میں یہ رائیں معیاری نظر آتی ہیں بقول ڈاکٹر مولوی عبدالحق "میر صاحب پہلے تذکرہ نویس ہیں جنھوں نے صحیح تنقید سے کام لیا ہے اور جہاں کوئی سقم نظر آیا ہے، بے رو رعایت اس کا اظہار کر دیا ہے اور ہر شاعر کے متعلق جو ان کی رائے ہے، اس کے ظاہر کرنے میں انھوں نے مطلق تامل نہیں کیا۔ یہ بات ہمارے تذکرہ نویسوں میں عام طور سے مفقود ہے وہ اپنے گروہ کے شاعروں کی جا بیجا تعریف کرتے ہیں۔ اور حریف گروہ والوں کی تعریف اول تو کرتے نہیں اور جو کرتے بھی ہیں تو دبی زبان سے اور اس میں بھی کوئی چوٹ ضرور کر جاتے ہیں۔ میر صاحب کی شان اس سے بہت ارفع تھی وہ کسی جتھے سے تعلق نہیں رکھتے"[2] اور ان کی یہ خصوصیت ان کی تنقیدی رائے کو بہت بلند مرتبہ بنا دیتی ہے۔ ان کی رائے میں خلوص ہوتا ہے۔ اگر وہ کسی پر سخت تنقید یا نکتہ چینی کرتے ہیں تو اس میں کسی فرقہ بندی یا جتھے بندی کو دخل نہیں ہوتا البتہ ہمدردی کے بجائے بے دردی کی جھلک کہیں کہیں ضرور نظر آجاتی ہے اور تنقید کے علاوہ مختلف اشخاص کی سیرت کے متعلق اس قدر برہنہ اور واشگاف رائیں پائی جاتی ہیں جن کو پڑھ کر واقعی حیرت ہوتی ہے۔ ایک تو یوں بھی یہ بات زمانے کی فضا کے خلاف تھی پھر یہ بات اور بھی مستزاد ہوئی کہ معاصرین پر رائے زنی کرتے ہوئے میر[3]

---

[1] Spingar in Creative criticism and other essays. Quoted by Farrel in "A Not on Literary Criticism..

[2] ڈاکٹر مولوی عبدالحق: دیباچہ تذکرہ ریختہ گویاں از فتح علی گردیزی: صفحہ ۱۲

[3] ڈاکٹر عبداللہ: شعرائے اردو کے تذکرے: مطبوعہ رسالہ اردو اپریل ۱۹۴۲ء صفحہ ۱۶۵-۱۶۶

سے ان کی دلشکنی کی مطلق پرواہ نہیں کی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ میر کی عام سیرت میں غرور اور خود بینی کا عنصر ضرور موجود تھا جس سے عام معاصرین کو گلہ ہے اگر میر کی تنقیدوں کو ان کی سیرت کی اس خامی کے ساتھ ملا کر دیکھا جاتے تو پھر شاید ہم میر کے معاصرین کی شکایت کو حق بجانب سمجھیں گے اس لئے میر صاحب کا لہجہ بعض شعراء کے ذکر میں طنز آمیز اور تلخ ہوتا ہے۔ جس سے تنقید میں ہمدردی نہیں بلکہ بے دردی کا احتمال پیدا ہو جاتا ہے۔[1]

اس میں شک نہیں کہ میر کی تنقید میں خامی ضرور ہے لیکن اس کی وجہ سے ان کی تنقید کو تنقید کہنے سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ کیونکہ ایسی رائیں نکات الشعراء میں بہت ہی کم ہیں زیادہ رائیں معقول اور جچی تلی ہیں جن میں خلوص بھی پایا جاتا ہے مثلاً میرزا سودا کے متعلق لکھتے ہیں "غزل و قصیدہ و قطعہ و مخمس و رباعی ہمہ را خوب می گوید۔ سرآمد شعرائے ہندی اوست۔ بسیار خوش گو است ہر شعرش طرف لطف رستہ رستہ و چمن بندی الفاظش گل معنی دستہ دستہ، ہر مصرع برجستہ اش را سرو آزاد بندہ، پیش فکر عالیش طبع عالی شرمندہ"[2] ان الفاظ کے ذریعہ میر نے سودا کی شاعرانہ اہمیت کو ذہن نشین کرا دیا ہے۔ ان کو اس بات کا احساس ہے کہ وہ ہندوستان کے بڑے شاعر ہیں۔ خوش گوئی ان کا حصہ ہے۔ ہر صنف میں طبع آزمائی کرتے ہیں اور خوب کرتے ہیں۔ ان کے اشعار کی معنوی حیثیت بہت بلند ہے صوری اعتبار سے بھی وہ اہم ہیں۔ کیونکہ ان کو الفاظ کی چمن بندی میں ملکہ حاصل ہے ان کا ہر مصرعہ حسین ہے اور سرو سے زیادہ حسین! ان کی فکر میں بلندی پائی جاتی ہے۔ ان خیالات کے تنقید ہونے سے انکار نہیں کیا جا سکتا یہ ٹھیک ہے کہ یہ خاص قسم کی تنقید ہے۔ جس کے طرز بیان میں الفاظ کی رنگینی کو زیادہ دخل ہے لیکن

۱؎ ڈاکٹر عبداللہ: شعرائے اردو کے تذکرے، مطبوعہ رسالہ اردو اپریل سنہ ۴۲ء ص ۱۶۵-۱۶۶ ۲؎ میر نکات الشعراء ص ۳۲-۳۳

یہ اس زمانے کا عام دستور تھا کہ عبارت رنگین، مقفّیٰ اور مسجع لکھی جاتی تھی۔

میر نے نکات الشعراء میں سودا کی طرح میر درد کے کلام پر بھی تنقیدی نظر ڈالی ہے۔ اور ان الفاظ میں ان کو سراہا ہے "خوش بہار گلستانِ سخن، عندلیب خوش خوانِ چمن این فن، زبان گفتگویش گرہ کشائے زلف شام مدعا، مصرعہ نوشتہ اش بر صفحہ کاغذ از کاکل ملیح خوش نما۔ طبع سخن پرداز او سرو مائل چمنستان انداز است۔ گاہے در کوچہ باغ تلاش بطریق گلگشت قدم رنجہ می فرماید۔ در چمن شعرش لفظ رنگیں چمن چمن، گلچیں خیال اورا گل معنی دامن دامن[1]" اس تحریر میں بھی اگرچہ وہی مخصوص انداز موجود ہے لیکن ان کو پڑھنے کے بعد میر درد اور ان کے کلام کی اہمیت پوری طرح ذہن نشین ہو جاتی ہے رنگینی کو اس میں بھی دخل ہے۔ لیکن یہ اس وقت کا تقاضا تھا کہ عبارت کو زوردار بنانے کے لئے اس کو مقفّیٰ اور مسجع بنا دیتے تھے۔ چنانچہ چوٹی کے شاعروں کے لئے میر نے عموماً رنگینی اور زیادہ مقفّیٰ اور مسجع عبارت استعمال کی ہے۔ اس کی وجہ یہی ہے کہ وہ ان شاعروں کے متعلق اپنے بیانات کو زیادہ زوردار بنانا چاہتے تھے۔

لیکن ان شاعروں سے کم تر درجے کے شاعروں کے کلام پر جب اظہارِ خیال کرتے ہیں تو ان کے لہجے اور اندازِ بیان میں ایک تغیر پیدا ہو جاتا ہے وہ ان کے لئے زیادہ نہیں لکھتے اور جو کچھ لکھتے ہیں اس کی عبارت مقفّیٰ و مسجع نہیں ہوتی۔ مثلاً میاں شرف الدین مضمون کے کلام پر ان الفاظ میں رائے دیتے ہیں "ہر چند کم گو بود لیکن بسیار خوش فکر و تلاش لفظ تازہ زیاد[2]" یا اشرف علی خاں افغان کے متعلق صرف یہ الفاظ استعمال کرتے ہیں "بسیار جوان قابل و ہنگامہ آرا، شعر ریختہ را بخوبی می گوید[3]" یا ان سے زیادہ الفاظ

---

[1] میر نکات الشعراء، ص ۵۳ [2] ایضاً ص ۱۶ [3] ایضاً ص ۴۸

میر عبدالحیٔ تاباں کے لئے استعمال کرتے ہیں "سمندر رنگینی فکرش با گلگونی بادبہا طابق النعل بالنعل است۔ ہرچند عرصۂ سخن او ہمیں در لفظہائے گل و بلبل تمام است۔ اما بسیار برنگینی می گفت"[۱] صاف ظاہر ہے کہ یہ خیالات ایک دوسرے سے مختلف ہیں اور ان میں ہر اعتبار سے ایک نمایاں فرق نظر آتا ہے میرؔ ہر شاعر کے مرتبے کے مطابق الفاظ استعمال کرتے ہیں اور ان کی رائیوں کو پڑھکر ہر شخص ان شاعروں کے متعلق صحیح رائے قایم کرسکتا ہے۔

تذکرہ نگاروں کی صاف گوئی | میرؔ کے تذکرے میں تنقید کی صاف گوئی بھی قابل غور ہے۔ جیسا کہ اوپر کہا جا چکا ہے، وہ کسی فرقہ بندی یا ادبی گروہ بندی کے پیش نظر، بعض شعرا کے خلاف رائیں نہیں دیتے۔ بلکہ واقعی جو کچھ محسوس کرتے ہیں۔ ان کو الفاظ میں پیش کردیتے ہیں ان کے نزدیک صاف گوئی بڑی اہمیت رکھتی ہے۔ انعام اللہ خاں یقین کے متعلق لکھتے ہیں "بعد از ملاقات ایں قدر معلوم شد کہ ذائقۂ شعر فہمی مطلق ندارد۔ شاید از ہمیں راہ مردماں گمان ناموزونیت درحق او داشتہ باشند۔ مجمعے برایں اتفاق دارند کہ شاعری او خالی از نقص نیست"[۲] یا محمد یار خاکسارؔ کے متعلق لکھتے ہیں "شعر را ریختہ می گوید و خود را دور می کشد و بسیار سفلگی می کند بلکہ از ننگ آبی بنائے ریختہ را بآب رسانیدہ"[۳] یہ خیالات ممکن ہے بعض لوگوں کے نزدیک صحیح نہ ہوں لیکن میرؔ نے جو کچھ ان کے متعلق سوچا تھا وہ بیان کردیا ہے اس میں کسی قسم کی بدگمانی یا فرقہ بندی کو دخل نہیں ہے کیونکہ میر عبدالحیٔ تاباں کی شاعری کو انھوں نے برے لفظوں میں یاد نہیں کیا ہے حالانکہ وہ اس بیان میں یہ کہتے ہیں "از چندے بسبب کم اختلاطی ایں، ہیچمداں کدورتے بمیان آمدہ بود"[۴]

---

[۱] میر: نکات الشعراء: ص۱۱۵ [۲] ایضاً ص۸۵ [۳] ایضاً ص۱۲۱ [۴] ایضاً ص۱۱۵

پھر بھی انھوں نے تاباں کی شاعری کے متعلق صحیح رائے دی ہے لکھتے ہیں "ہر چند عرصۂ سخن او ہمیں در لفظہائے گل و بلبل تمام است، اما بسیار رنگیں می گفت"[1] یہ خصوصیت میر کو بہت بلند کر دیتی ہے اور اس کے نتیجے میں ان کے تذکرے کی تنقیدی اہمیت بھی مسلم ہو جاتی ہے۔

میر حسن کا تذکرہ اگرچہ صاف گوئی میں میر تک نہیں پہنچتا۔ لیکن اس میں بھی جچی تلی رائیں ضرور ملتی ہیں۔ بڑے شاعروں اور مسلم الثبوت استادوں کے کلام پر رائے زنی وہ بھی زور دار الفاظ اور رنگین عبارت میں کرتے ہیں۔ سودا کے متعلق ان کا خیال ہے "استاد شعرائے عصر و بلغائے دہر میدان بیان او وسیع و طرز معانی او بدیع، بر سپاہ دانش شاہ و بر آسمان بینش ماہ۔ در قصیدہ و ہجو ید بیضا دارد۔ قصائد عذب دل آویز و بیان ہجو بلند، نظمش طرب انگیز است"[2] اسی طرح میر کے کلام پر ان الفاظ میں روشنی ڈالتے ہیں "میر شاعر ہندوستان و افصح فصحائے زمان، شاعر دل پذیر و سخن سنج بے نظیر، میاں محمد تقی میر المتخلص بہ میر، رفعت رواق کاخ بیانش از طاق سپہر برتر و دگوہر کان ضمیرش از جوہر مہر عالی گوہر، فکر عالیش در عین خوش آبی، و طبع روانش بہ نہایت شادابی چراغ نثر روشن و ساخت نظمش گلشن، شعرش چوں در خوش آب و انداز سخنش بے حساب صیقل ذکائے رنگ زدائے آئینہ خورشید پیش عنایے او روئے اختشاں ماہ سفید"[3] لیکن جب وہ جرأت اور انشا کے متعلق رائے دینے پر آتے ہیں تو لہجہ بدل جاتا ہے۔ جرأت کے متعلق ان الفاظ میں رائے دیتے ہیں "کلامش نمکین و بیانش شیریں، دستگاہ شعورش چوں دل صاحب ہمتاں فراخ و گلزار معانیش

[1] میر نکات الشعرا: ص ۱۱۵ [2] میر حسن تذکرۂ شعرائے اردو: ص ۸۲-۸۳ [3] ایضاً: ص ۱۵۱ [4] ایضاً: ص ۱۹۱

چوں میوۂ آرزو در شاخ[1]" اور انشاؔ کے متعلق یہ الفاظ استعمال کرتے ہیں "طبع تازہ و ذوق بے اندازہ، شراب معانی و ذوق جوانی فرح بخش و مسرت افزاست . . . . نومشق است۔ اکثر طرز او بطرز میرؔ سوز می ماند[2]" میر حسن نے میرؔ و سوداؔ کے کلام پر جس انداز میں رائے دی ہے، اس سے انشاؔ اور جرأتؔ کا بیان مختلف ہے۔ لہجے کا فرق صاف واضح ہے۔

اس سے بھی یہ اندازہ ہوتا ہے کہ میر حسنؔ کے ذہن میں بھی جانچنے اور پرکھنے کا کوئی معیار ضرور تھا۔ اس میں شک نہیں کہ اس میں ان کے ذوق اور وجدان کو زیادہ دخل ہے۔ میرؔ کی طرح وہ بھی صاف گوئی سے کام لیتے ہیں اور بعض شاعروں کے کلام کو برا کہنے سے باز نہیں رہتے۔ اور انشاؔ ہی کو وہ نومشق کہہ چکے ہیں اس کے علاوہ آشوبؔ کے متعلق لکھتے ہیں "قدم در سخنوری گذاشتہ است۔ پوچ و بے معنی و ناموزوں میگوید[3]" میاں جگنؔ کے متعلق ان خیالات کا اظہار کرتے ہیں "دعوائے شاگردی میر تقی میر می نماید۔ از مشاہراں ہست[4]" لیکن میرؔ کے مقابلے میں ان کے یہاں اس قسم کے بیانات کم ہیں۔ بہرحال میر حسن کے تذکرے میں بھی یہ تنقیدی پہلو موجود ہے۔

گلشن بے خار کا پلہ ان سب میں تنقیدی اعتبار سے بھاری ہے۔ کیونکہ شیفتہ بڑے سے بڑے شاعر کے متعلق بھی صحیح رائے دینے اور اس کی خامیوں کو اجاگر کر کے پیش کرنے سے باز نہیں آتے۔ مثلاً میر کو بڑا شاعر تسلیم کر لیتے اور ان الفاظ میں ان کی تعریف کرنے کے بعد "صد آہ دردناک بتاثیر یک مصرع او نیست و ہزار عزائم تسخیر ہم فسوں سنیم تتبعش گو حلاوت سخنش بکام مشتاقاں گوارا تر از شہد لعل شکربار است[5]" ان

۱؎ میر حسن، تذکرہ شعرائے اردو: ص ۲؎ ایضاً، ص۴۳ ۳؎ ایضاً: ص ۴؎ شیفتہ: گلشن بے خار ص۲۱

کی شاعری میں رطب ویابس کی طرف اشارہ کرتے ہیں اور ساتھ ہی ساتھ ان کی شاعری میں خوش فکری کے فقدان کے متعلق ان الفاظ میں روشنی ڈالتے " پست وبلند کہ ورکلامش بینی ورطب ویابس کہ درابیاتش نگری نظرنہ کنی وازنظرش نیفگنی کہ گفتہ اند ؎

شعر گر اعجاز باشد بے بلند وپست نیست در ید بیضا ہمہ انگشتہا یکدست نیست

...... در قصیدہ فکر خوشے نداشتہ چنانکہ غزلش بلند مرتبہ است ہمچناں قصیدہ اش پست پایہ تر"[1] لیکن غزل گوئی اور مثنوی گوئی میں وہ ان کے قائل ہیں۔ چنانچہ کہتے ہیں " بافنون نظمیہ ربط تمام وارد ولاسیما در غزل سرائی ومثنوی گوئی گوئے سبقت می رباید"[2] میر کے متعلق یہ خیال بالکل صحیح ہے اس میں شک نہیں کہ وہ غزل گوئی کے بادشاہ تھے اور ان سے بڑا غزل گو شاعر اردو میں پیدا نہیں ہوا۔ لیکن ان غزلوں میں رطب ویابس موجود ہے مثنویاں انھوں نے کہی ہیں۔ خوب کہی ہیں۔ لیکن ان میں داخلی رنگ غالب ہے البتہ قصیدہ ان کا میدان نہیں تھا۔ ان کی طبیعت اس بار کی متحمل ہی نہیں ہو سکتی تھی۔ اسی وجہ سے جو قصیدے انھوں نے کہے ہیں وہ قصیدے کی خصوصیات سے محروم ہیں چنانچہ ان کو کامیاب قصیدہ گو نہیں کہا جاسکتا۔

شیفتہ نے میر کی شاعری کے متعلق ان حقائق کو کس قدر نپے تلے انداز اور لطیف پیرائے میں پیش کیا ہے۔ اسی طرح میر حسن کی شاعری پر نظر ڈالتے ہوئے وہ اس حقیقت سے چشم پوشی نہیں کرتے کہ ان کی شاعری میں فنی فروگذاشتیں ہیں " بر اصناف سخن فی الجملہ قدرتے داشتہ لاسیما مثنوی نیکو گفتہ۔ مثنوی سحر البیان کہ مشہور بہ بدر منیر است شہرت تمام دارد۔ قطع نظر بالفرہائے شاعری بہ محاورہ عوام بد نگفتہ بلکہ داد بلاغت دادہ است"[3] یہ خیال میر حسن کے

[1] شیفتہ: گلشن بے خار: ص۱۷۱ [2] ایضاً: ص۱۷۱ [3] ایضاً: ص۵۸

متعلق بالکل صحیح ہے۔ میر حسن اگرچہ بڑے شاعر ہیں اور ان کی مثنوی سے بہتر مثنوی اردو میں آج تک نہیں لکھی گئی لیکن ان کے کلام میں بعض جگہ غلطیاں ملتی ہیں جن کی طرف شیفتہ نے بھی اشارہ کر دیا ہے۔ انشا کے متعلق بھی انھوں نے صاف صاف یہ رائے ظاہر کی ہے "دیوانے دارد مشتمل بر اصناف سخن و ہیچ صنف را بطریق راسخہ شعرا نگفتہ اما در شوخی طبع و جودت ذہن او سخنے نیست"[۲] انشا کے متعلق اس سے زیادہ صحیح تنقیدی رائے اور کیا ہو سکتی ہے وہ استاد ضرور تھے۔ انھوں نے ہر صنف سخن میں طبع آزمائی کی۔ لیکن کبھی سنجیدگی کو اپنے پاس نہیں آنے دیا۔ جس کی وجہ سے ان کی تقریباً ساری شاعری غیر سنجیدہ ہے۔ البتہ اس میں ان کی ذہانت، شوخی اور طباعی کا پتہ ضرور چلتا ہے۔ سودا کی شاعری کے متعلق شیفتہ نے یہ رائے دی ہے "بہ فنون شاعری مناسبت تام دارد و بر اصناف سخن قدرت تمام آنکہ بین الانام شہرت پذیر است کہ قصیدہ اش بہ از غزل است حرفیست مہمل، بزعم فقیر غزلش بہ از قصیدہ است و قصیدہ اش بہ از غزل"[۳] سودا کے کلام کے متعلق عام خیال یہی ہے کہ وہ قصیدے کے بادشاہ ہیں۔ غزل ان کا میدان نہیں۔ لیکن حقیقت اس کے برعکس ہے۔ سودا ہر صنف سخن کے استاد ہیں۔ شیفتہ نے اسی حقیقت کو واضح کرنے کی کوشش کی ہے۔

یہ تمام رائیں کس قدر جچی تلی ہیں ان کو دیکھنے کے بعد یہ احساس ہوتا ہے کہ انکے پیش کرنے والے نے تمام شعرا کے کلام کا گہرا مطالعہ کیا ہے۔ اس کی نظر میں وسعت گہرائی اور دقت ہے عام خیال سے وہ متاثر نہیں ہوتا بلکہ اپنی رائے آزاد طریقے سے قایم کرتا ہے۔ عبارت اس کی بھی اکثر جگہ دلآویز اور رنگین ہے۔

گلشن بے خار میں خامیاں بھی ہیں بعض شاعروں کا ذکر کرتے ہوئے شیفتہ نے

---

[۱] شیفتہ: گلشن بے خار: ص۵۵ [۲] ایضاً: ص۱ [۳] ایضاً: ص۴

غلطی کی ہے۔ وہ ان کو پوری طرح سمجھ نہیں سکے ہیں۔ انھوں نے ان کے شاعر ہونے ہی سے انکار کر دیا ہے۔ مثلاً نظیر اکبرآبادی کے متعلق ان کی رائے کو اہمیت نہیں دی جا سکتی ان کے خیال میں نظیر شاعر نہیں ہیں۔ لیکن اگر ان کے زمانے کے حالات کی روشنی میں دیکھا جائے تو یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ اپنے معیار کے مطابق انھوں نے ٹھیک رائے دی ہے۔ شاعری کے متعلق ان کے جو معیار تھے اس پر نظیر پورے نہیں اترتے تھے۔ ان کی شاعری شاعری ہی نہیں تھی۔ اس میں ابتذال تھا۔ رکاکت تھی۔ مروجہ انداز سے ہٹ کر ایک نیا راستہ نکالنے کی کوشش تھی۔ نظیر نے عوام کو اپنا موضوع بنایا تھا لیکن اس زمانے میں شاعری ایک خاص طبقے کی ملکیت تھی یہ طبقہ اونچا طبقہ تھا۔ ان کے خاص معیار تھے۔ خاص خیالات و نظریات تھے شیفتہ کا تعلق بھی اسی طبقے سے تھا اور وہ ان معیاروں کو نظر انداز نہیں کر سکتے تھے۔

ویسے مجموعی اعتبار سے اگر شیفتہ کے تذکرے کو دیکھا جائے تو اس میں نہایت سوجھی سمجھی رائیں ملتی ہیں، اور صحیح قسم کی تنقید کا پتہ چلتا ہے۔

(۲) فارسی شاعروں سے مقابلہ | تنقیدی رائے دیتے وقت یہ تذکرہ نویس کہیں کہیں اردو شاعروں کا فارسی شاعروں سے مقابلہ بھی کرتے چلتے ہیں اگرچہ اس میں بھی حد درجہ اختصار سے کام لیا جاتا ہے لیکن اس سے اردو شاعر کے طرز کلام سے بخوبی آگاہی ہو جاتی ہے۔ اور یہ بھی پتہ چل جاتا ہے کہ وہ فارسی کے کون سے شاعر سے متاثر ہوتے ہیں اور یہ مقابلہ صرف فارسی شاعروں ہی سے نہیں کیا جاتا بلکہ کہیں اردو شاعروں کا آپس ہی میں مقابلہ کیا جاتا ہے۔ جس سے زیر نظر شاعر کے کلام کی خصوصیات پوری طرح اجاگر ہو جاتی ہیں۔

میر اپنے تذکرے نکات الشعرا میں محمد حسین کلیم کا مقابلہ بیدل اور کلیم سے کرتے ہیں۔

اکثر زبان میرزا بیدل حرف می زند۔ . . . . . اگرچہ کلیم در فارسی گزشتہ است اما کلیم

ریختہ پیش فقیر انیست [۱]" اسی طرح میرزا مظہر جانجاناں کے متعلق لکھتے ہیں " مختصر شعر فارسی او بنظر فقیر مولف آمدہ است ۔ از تسلیم وکلیم بائے کلی ندارد [۲]" لیکن میرؔ کے یہاں ان سے تقابل پہلو کم ملتے ہیں پھر بھی جہاں کہیں انھوں نے اس انداز سے کام لیا ہے، وہاں وہ کامیاب ہوئے ہیں اور انھوں نے اس انداز سے کام لیا ہے۔ وہاں وہ کامیاب ہوتے ہیں اور انھوں نے اس شاعر کے رنگ کلام کو نمایاں کردیا ہے ۔

نکات الشعرا کے مقابلے میں میر حسن کے تذکرہ شعرائے اردو میں یہ پہلو زیادہ نمایاں ہے۔ میر حسن اس میں بہت پیش پیش رہے ہیں۔ انھوں نے اپنے تذکرے کئی شاعروں کا مقابلہ فارسی اور اردو کے دوسرے شاعروں سے کیا ہے۔ میرؔ کا مقابلہ وہ فارسی شاعر شفائی سے کرتے ہیں۔ لکھتے ہیں " طرز ما بطرز شفائی [۳]" اور اس میں شک نہیں کہ شفائی کے یہاں بھی رنج وغم کا بیان اسی طرح ملتا ہے ، جیسا میر تقی کے یہاں ۔ ان دونوں کا اگر تقابلی مقابلہ کیا جائے تو یہ حقیقت واضح ہوجاتی ہے کہ میرؔ نے ضرور شفائی کا اثر قبول کیا ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ انھوں نے شفائی کا بغور مطالعہ کیا تھا اور اسی وجہ سے اس کے اثرات ان کی شاعری میں اس قدر گہرے نظر آتے ہیں۔ اس کے علاوہ انھوں نے اثر کا مقابلہ میر سوز سے کیا ہے لکھتے ہیں " اکثر طرز او بطرز میر سوز می ماند [۴]" میر درد کے متعلق کہتے ہیں " دیوانش اگرچہ مختصر است لیکن چوں کلام حافظ سراپا انتخاب [۵]" قائم چاندپوری کے متعلق لکھتے ہیں " طرزش بطرز طالب آملی می ماند [۶]" ان مقابلوں سے صرف رنگ کلام کا اندازہ ہوجاتا ہے۔ اور ایک عام خصوصیت کی وضاحت ہوجاتی ہے ۔

لیکن شیفتہ کا تذکرہ " گلشن بے خار " اس سلسلے میں بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ شیفتہ

---

۱ میر تقی میر: نکات الشعرا ، صفحہ ۸۴ ۲ ایضاً: صفحہ ۵ ۳ میر حسن تذکرہ شعرائے اردو: صفحہ ۱۵۱ ۴ ایضاً: صفحہ ۱۹
۵ ایضاً: صفحہ ۷۲ ۶ ایضاً: صفحہ ۱۲۸

ایک شاعر کو دوسرے شاعر سے تشبیہہ ہی نہیں دیتے بلکہ اس کے کلام کی خصوصیات کو نمایاں کر کے مقابلہ کرتے ہیں غالب کے پہلے دور کے کلام کا بیدل سے مقابلہ کرتے ہوئے انھوں نے دقت آفرینی کی طرف اشارہ کیا ہے۔ جو میرزا بیدل کے کلام کی خصوصیت تھی اور جس کو غالب نے ابتدا میں اپنا لیا تھا "دراوائل حال بتقاضائے طبع دشوار پسند بطرز بیدل سخن می گفت و دقت آفرینہا می کرد"[1] اور اس کے بعد وہ ان کا مقابلہ عرفی و نظیری سے کرتے ہیں "غزلش چوں غزل نظیری بے نظیر و قصیدہ اش چوں قصیدہ عرفی دلپذیر"[2] ظاہر ہے کہ شیفتہ کے گلشن بے خار میں جو تقابل پہلو نمایاں ہے وہ زیادہ اہم ہے کیونکہ اس میں زیادہ تفصیل اور گہرائی پائی جاتی ہے۔

بہر حال یہ تذکرہ نویس اپنی رائے کو مختلف طریقوں سے مضبوط بناتے تھے۔ بغیر سوچ سمجھے یوں ہی رائے دے دینا ان کو پسند نہیں تھا وہ صرف شاعر زیر نظر کے کلام کا مطالعہ نہیں کرتے تھے بلکہ جن سے مقابلہ کرتے تھے ان کے کلام کا مطالعہ بھی ان کے نزدیک ضروری تھا۔ تنقید میں اس مقابلے کی بڑی اہمیت ہے یہ صحیح ہے کہ تمام تذکرہ نویس اس طرف پوری طرح توجہ نہیں کرتے اور جو کرتے بھی ہیں وہ بھی سب شاعروں پر اس طرح رائے نہیں دیتے صرف چند پر رائے دینے کے سلسلے میں تقابل تنقید سے کام لیتے ہیں۔ اس لئے بہر حال تذکروں میں یہ عنصر مل ضرور جاتا ہے۔

(۳) اصلاح | یہ تذکرہ نویس، مختلف شاعروں کے کلام پر رائے دیتے ہوئے کہیں کہیں ان کے بعض اشعار پر اصلاح بھی دیتے ہیں جس سے ان کے تنقیدی شعور کا پتہ چلتا ہے۔ یہ اصلاح ان دنوں کے رواج کے مطابق لفظی ہوتی ہے۔ معنوی پہلو سے اس کو کوئی تعلق نہیں ہوتا۔

---

[1] شیفتہ: گلشن بے خار: ص ۱۳۹ [2] ایضاً: ص ۱۳۹

لیکن اس زمانے کا عام معیار یہی تھا۔ پھر بھی ان اصلاحوں کو دیکھ کر یہ اندازہ ضرور ہو جاتا ہے کہ وہ یوں ہی شعر کے متعلق رائے قایم نہیں کر لیتے تھے بلکہ اس پر فنی اصولوں کی روشنی میں غور کرتے تھے۔

میر کے تذکرے نکات الشعرا میں یہ پہلو سب سے زیادہ نمایاں ہے۔ انھوں نے کئی اشعار پر اصلاحیں دی ہیں۔ شاہ مبارک آبرو کا ایک شعر ہے ؎

نہیں تارے بھرے ہیں شک کے نقط　　　اس قدر نسخۂ فلک ہے غلط

میر اپنے تذکرے میں اس کو نقل کر کے کہتے ہیں "اگر بجائے 'اس قدر' 'کس قدر' میگفت، شعر بآسماں میرسید"[1]

اسی طرح میاں شرف الدین مضمون کا یہ شعر انتخاب کیا ہے ؎

میرا پیغام وصل اے قاصد　　　کہیو، سب سے اسے جدا کر کے

اور پھر اس کے متعلق لکھتے ہیں "اتفاقاً من اشعار ایشاں را انتخاب میردم، میاں محمد حسین کلیم کہ احوال اوشاں نیز خواہد آمد انشاء اللہ تعالیٰ، اوشاں نیز نشستہ بودند۔ من ایں شعر را پیش مشارٌ الیہ خواندم، و شعر ایں قسم بود

میرے پیغام کو تو اے قاصد　　　کہیو سب سے اُسے جُدا کر کے

چوں ایں حرف موافق سلیقۂ شعر ابود لہذا ہمچناں نوشتہ آمد"[2] مصطفےٰ خاں یک رنگ کا یہ شعر لکھ کر ؎

سچ کہے جو کوئی سو مارا جائے　　　راستی ہے گی دار کی صورت

اس پر یہ رائے ظاہر کی ہے "باعتقاد فقیر بجائے سچ، حرف حق اولیٰ است"[3] میر سجاد کا یہ شعر انتخاب کیا ہے ؎

---

[1] میر: نکات الشعرا: ص ۱۰۱　[2] ایضاً: ص ۱۰۷

کافرہتوں سے داد نہ چاہو کہ یاں کوئی　　مرجا ستم سے ان کے تو کہتے ہیں حق ہوا

اور پھر اس رائے پر یہ رائے ظاہر کی ہے " اگرچہ باطل باطل است لیکن بجائے کافر کہ اول مثل مصرع واقع است باعتقاد فقیر لفظ باطل حق است"[1]

میر کے علاوہ میر حسن نے بھی اسی طرح کی اصلاحیں بعض شعرا کے اشعار پر دی ہیں معین کے اس شعر پر ؎

خوش ہم عریانی سے اپنی ہیں برنگ بوئے گل　　نکلے جاتے ہیں ٹھہرتے نہیں پوشاک میں ہم

یہ رائے ظاہر کرتے ہیں " خوش ہم عریانی، ناموزوں است چناں کہ میم بارا چناں چسپیدہ است کہ عین چوں چشم غزال از میاں رم کردہ است واں سخت عیب است"[2] یہ عروض کی اصلاح ہے معین ہی کے ایک مصرع پر محاورہ کی اصلاح کرتے ہیں۔ مصرعہ یہ ہے: " نہ آیا یار دوپہری بھی اب ڈھلی افسوس"۔ اصلاح کرتے ہوئے لکھتے ہیں " ایں محاورہ درست نیست۔ مردم شاہجہاں آباد ' دوپہر ڈھلی' گویند نہ دوپہری۔ مگر مردم بیرونجات"[3] اس سے یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ یہ لوگ اہل زبان ہی کی زبان کو مستند سمجھتے تھے۔ زبان کے فرق کی طرف بھی ان کی توجہ رہتی ہے۔ سجاد کا یہ شعر انتخاب کرکے ؎

تجھے غیر سے صحبت اب آپنی　　ایسی دوستی ہم سے ہے دشمنی

لفظ ایسی، کے متعلق لکھتے ہیں " لفظ ایسی دوستی، زبان قدیم است یعنی برائے ہمیں"[4]

نہ صرف یہ کہ یہ لوگ زبان و بیان اور عروض کے متعلق اپنی اصلاحیں دے دیتے تھے بلکہ دوسروں کی دی ہوئی اصلاحوں پر محاسبہ بھی کرتے تھے۔ جس کی ایک مثال یہ ہے کہ میر نے خاکسار کے ایک شعر پر اصلاح دی تھی وہ شعر یہ تھا ؎

---

[1] میر حسن: تذکرہ شعرائے اردو: ص ۱۲۵-۱۲۶　[2] ایضاً: ص ۱۲۶　[3] ایضاً: ص ۸۱

خاک اس کی توان آنکھوں کے کئی مت لگیو مجھ کو ان خانہ خرابوں ہی نے بیمار کیا

اس پر میر نے یہ رائے ظاہر کی تھی "بر منبع این فن پوشیدہ نیست کہ بجائے بیمار کیا، گرفتار کیا، می بایست"[1] میر حسن خاکسار کے بیان میں اس شعر کو نقل کر کے لکھتے ہیں "میر تقی میگوید کہ اگر بہ جائے 'بیمار کیا' گرفتار کیا، می شد بہتر می بود، لیکن در عقل فقیر چنیں می گزرد کہ اگر چشم خود می بود، گرفتار مناسب بود، چوں این جا چشم معشوق ست بیماری صحت دارد"[2] اس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ یہ اصلاحیں بہت سوچ سمجھ کر دی جاتی تھیں۔ میر حسن میر کو بڑا شاعر سمجھتے ہیں لیکن اس کے باوجود ان کی اصلاح کو صحیح نہیں سمجھتے کیونکہ اس کے غلط سمجھنے کے لئے ان کے پاس جواز موجود ہے۔

تذکروں میں اس اصلاح کے پہلو سے پڑھنے والے کو ایک تنقیدی معیار اور تنقیدی شعور کا پتہ چلتا ہے اس میں شک نہیں کہ آج کے تنقیدی زاویۂ نظر سے دیکھا جائے تو یہ پہلو اتنا زیادہ اہم نہیں معلوم ہوتا لیکن اُس زمانے میں جب کہ شعر کے جانچنے اور پرکھنے کا معیار ہی یہ تھا۔ اسی قسم کی تنقید کی جاسکتی تھی۔ اس سے زیادہ توقع کی ہی نہیں جاسکتی۔ کلیم الدین احمد تک اس کی تنقیدی اہمیت سے انکار نہیں۔ تذکروں کے اس پہلو کا ذکر کرتے ہوئے ایک جگہ لکھتے ہیں "صاف ظاہر ہے کہ یہ تنقید محض سطحی ہے۔ اس کا تعلق زبان، محاورہ اور عروض سے ہے۔ لیکن یہی تنقید ایک مدت دراز تک فضائے اُردو پر محیط ہوگئی۔ لیکن ان تذکروں میں اس قسم کی تنقید بھی کم ملتی ہے"[3] اس زمانے کے معیار سے اگر دیکھا جائے تو یقیناً یہ تنقید سطحی معلوم ہوگی۔ لیکن اُس زمانے کے اعتبار سے وہ سطحی نہیں تھی۔ کیونکہ اُس زمانے کی تنقید کا معیار ہی یہی تھا۔ اس لئے اس کے تنقید ہونے میں کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں۔

---

[1] میر: نکات الشعرا: ص ۱۲۳ [2] میر حسن: تذکرہ شعرائے اردو: ص ۶۱ [3] کلیم الدین احمد: اردو تنقید پر ایک نظر: ص ۲۲

البتہ یہ ٹھیک ہے کہ ان تذکروں میں اصلاحوں کا یہ سلسلہ زیادہ طویل نہیں ہے۔ بات یہ ہے کہ ان میں اشعار کا انتخاب کرتے وقت تذکرہ نویسوں کا مقصد اصلاح نہیں ہوتا تھا۔ وہ صرف اپنے مذاق کے مطابق اچھے اشعار کا انتخاب کرنا چاہتے تھے۔ لیکن جہاں کہیں انھیں کوئی بات کھٹکتی تھی وہ اس کی طرف اشارہ کر دیتے تھے۔ اسی وجہ سے ہمیں تذکروں میں اس کی کمی محسوس ہوتی ہے۔ لیکن بہر حال یہ تنقیدی روایت تذکروں میں موجود ہے تذکروں سے ملتی جلتی ایسی کتابیں بھی موجود ہیں جن میں اصلاحات ہی کا بیان پایا جاتا ہے۔ ان کا ذکر آگے آئے گا

(۴) ادبی تحریکوں کا ذکر | یہ تذکرہ نویس کہیں کہیں اپنے تذکروں میں اپنے زمانے کی مختلف ادبی تحریکوں کا ذکر بھی کرتے ہیں اور ان کے متعلق جو رائے دیتے ہیں، ان سے ان کے تنقیدی شعور پر روشنی پڑتی ہے۔

قدما کی ایک منظم ادبی تحریک "ابہام گوئی" ہے۔ جس کا ایک زمانے تک چرچا رہا۔ ابتدا میں شمالی ہند کے تمام شاعر اسی رنگ میں رنگ گئے تھے۔ آبرو اور شاکر ناجی وغیرہ اس تحریک کے علمبردار ہیں۔ ان شاعروں کا ذکر کرتے ہوئے اکثر تذکرہ نویسوں نے اس تحریک پر بھی اظہار خیال کیا ہے جس سے ان کے ادبی معیار اور ذہنی رجحان پر روشنی پڑتی ہے اور ان کے تنقیدی شعور کا اندازہ ہوتا ہے۔

میر حسن اسد یار خاں انسان کے بارے میں لکھتے ہیں: "باید دانست کہ سخن سنجانِ آں زماں در پے صنعت ابہام می بودند و تلاش لفظ تازہ می نمودند۔ چوں طرز تازہ بود، خوش می آمد، لیکن اکثرے ازیں بجر گوہر شہوار بردند و بعضے بہ سبب تلاش لفظ خزف ریزہ بکف آوردند۔ چار و ناچار برائے یادگار قلم می نماید، معذور باید داشت"[1] شاکر ناجی پر اس تحریک

[1] میر حسن: تذکرہ شعرائے اردو: صفحہ ۶۰

کا اثر ان الفاظ میں دکھاتے ہیں: "تلاش صنعت ایہام بسیار داشت کہ رائج الوقت متوسطین بود[1] حاتم کے ذکر میں لکھتے ہیں: "دو دیوان ترتیب دادہ۔ یکے بہ زبان قدیم بطور ایہام و دوم بہ زبانِ حال ادائیہ[2] ان بیانات سے ایہام گوئی کی تحریک پر روشنی پڑتی ہے اور اس کے متعلق میر حسن کے خیالات کا پتہ بھی چل جاتا ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ انھوں نے اس کے بیان میں تفصیل سے کام نہیں لیا۔ بہرحال ان کا اندازیہ ضرور بتا دیتا ہے کہ وہ ایہام گوئی کی تحریک کو بہت زیادہ پسند نہیں کرتے تھے۔

دوسرے تذکرہ نویسوں نے بھی اس قسم کی تحریکوں کا ذکر کیا ہے ایسے تذکروں میں قدرت اللہ قاسم کا تذکرہ مجموعۂ نغز، مصحفی کا تذکرۂ ہندی، مرزا علی لطف کا گلشن ہند، شیفتہ کا گلشن بے خار اور میرزا قادر بخش صابر کا گلستانِ سخن خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ میر حسن کی طرح یہ لوگ بھی ایہام گوئی کے متعلق اچھی رائے نہیں رکھتے جس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ یہ لوگ ایہام گوئی شاعری کا معیار نہیں سمجھتے تھے۔ بلکہ اس کا معیار کچھ اور تھا جس کا اظہار بھی وہ وقتاً فوقتاً کرتے رہتے۔

بہرحال تذکروں کا یہ پہلو بھی، ان کی تنقیدی اہمیت پر دلالت کرتا ہے اور اس حقیقت کو ذہن نشین کرتا ہے کہ ان کے پاس ایک تنقیدی معیار تھا ضرور!

اشعار کا انتخاب تذکروں میں سیرت نگاری اور تنقیدی اشاروں کے علاوہ شعرا کا انتخاب بھی تذکرہ نگاروں کے تنقیدی شعور پر دلالت کرتا ہے۔ یہ لوگ جب شاعروں کے کلام سے اشعار کا انتخاب کرتے تھے تو ان کے پیش نظر شعر کو اچھا سمجھنے کے لئے ایک معیار ضرور ہوتا تھا اس میں شک نہیں کہ اس معیار کی نوعیت ذوقی اور وجدانی تھی، جس کا اندازہ اُس انتخاب ہی

---

[1] میر حسن: تذکرہ شعرائے اردو: صفحہ ۱۸۱ [2] ایضاً: صفحہ ۴۶

سے ہوتا ہے۔

یہی نہیں کہ یہ لکھنے والے صرف بعض اشعار کو اچھا سمجھ لیتے تھے بلکہ وہ بعض اشعار کو بہت اچھا سمجھتے تھے۔ اور بعض کو کم! بعض اشعار میں ان کو سمویا ہوا خیال پسند آتا تھا، لیکن زبان کے اعتبار سے وہ ان کے نزدیک کم مرتبہ تھے۔ چنانچہ ایسے موقعوں پر وہ اصلاح دے دیا کرتے تھے۔ مثال کے طور پر میرؔ نے نکات الشعرا میں مختلف شعرا کے کلام کا انتخاب پیش کیا ہے اس کے بعض بعض اشعار پر تو وہ جھوم جھوم گئے ہیں۔ میر سجادؔ کا یہ شعر ؎

عشق کی ناؤ پار کیا ہووے جو یہ کشتی تری تو بس ڈوبی

انتخاب کرنے کے بعد اس پر یہ رائے ظاہر کی ہے "ہمہ شعر سبحان اللہ لیکن فقیر را از دیدن ایں شعر تواجد دست بہم می دہد از بسکہ خواندن ایں شعر خطے بر میدارم۔ میخواہم کہ صد جا بنویسم"[1] اس سے اندازہ ہوا کہ یہ شعر ان کو بہت پسند آیا۔ اور اس سلسلے میں ان کے ذوق اور وجدان نے رہنمائی کی لیکن کہیں کہیں منتخبہ شعر میں باوجود معنوی اعتبار سے بلند ہونے کے وہ اس پر اعتراض کرنے سے باز نہیں آتے اور اعتراض کے ساتھ ہی ساتھ اس پر ہمدردانہ انداز میں اصلاح بھی دے دیتے ہیں۔ سجادؔ ہی کے اس شعر پر ؎

میرا جلا ہوا دل مژگاں کے کب ہے لائق اس آبلے کو کیوں تم کانٹوں میں کھینچتے ہو

ایک اعتراض کے بعد اصلاح کرتے ہیں لکھتے ہیں "ہر چند در مثل تصرف جائز نیست زیرا کہ مثل ایں چنیں است (کہ کیوں کانٹوں میں گھسیٹتے ہو) لیکن چوں شاعر را قادر سخن یافتم معاف داشتم"[2] اصلاح کی اہمیت صاف ظاہر ہے۔

ان مثالوں سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ یہ تذکرہ نویس یوں ہی بغیر کچھ سوچے سمجھے اشعار

---

[1] میر: نکات الشعرا: ص۵۰ [2] ایضاً: ص۴۳

کا انتخاب نہیں کر لیا کرتے تھے۔ بلکہ اس میں ان کے تنقیدی شعور کو خاصا دخل ہوتا تھا۔ لیکن اس تنقیدی شعور کا اس زمانے کے مروجہ تنقیدی معیاروں کے دائرے سے باہر نکلنا مشکل تھا۔

بلاشبہ تمام تذکروں میں یہ خصوصیات نہیں ہیں۔ بعض بلکہ زیادہ تذکرے خامیوں سے پُر ہیں جیسا کہ کریم الدین نے لکھا ہے "ان کے خیال میں جو سمایا تھوڑا سا حال خیالی لکھ کر شعر اس کے لکھ دیئے اور جس کا حال لکھنا منظور تھا گرچہ وہ پسند خاطر مورخین کی نہ ہو۔ اگر کسی پر مہربانی داعی ہوئی تو اس کے شعر بہت لکھ دیئے ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان لوگوں کو صرف تشہیر اشعار اور اپنی ناموری مقصود تھی۔ علاوہ ازیں انتخاب اشعار میں بھی بہت بے پروائی کی ہے۔ طرفہ تر یہ ہے کہ جس کے اشعار بہت اچھے ہوتے تھے اور وہ مسلم الثبوت استاد تھا۔ اس کے شعر اس طرح پر انتخاب کئے ہیں کہ برا ہونا افکار اس شاعر کا ثابت ہو جاوے ایسی ایسی حکمت عملی بعض تذکرہ نویسوں نے کی ہے[1] لیکن سب تذکروں کا یہ حال نہیں ہے۔ خصوصاً نکات الشعرا تذکرہ میر حسن۔ اور گلشن بے خار کے متعلق یہ خیال نہیں کیا جا سکتا ان تذکروں میں اشعار کے انتخاب کے سلسلے میں ذوق اور وجدان کا سہارا لیا گیا ہے جس کی بنیادیں اس وقت کے مروجہ تنقیدی معیاروں پر استوار نظر آتی ہیں۔

بہرحال تذکروں میں اشعار کے انتخاب کی بھی ایک تنقیدی اہمیت ہے کیونکہ وہ بھی ایک تنقیدی شعور کے ماتحت کیا جاتا تھا

شعر و شاعری کے متعلق نئی مباحث تذکرے ایک خاص مقصد کے پیش نظر مرتب کئے جاتے تھے جس میں شاعروں کے مختصر حالات اور کلام کے انتخاب کو اہمیت حاصل تھی۔ تنقیدی پہلو کا نمایاں کرنا ان لکھنے والوں کا مقصد نہیں تھا لیکن اس کے باوجود ان میں تنقیدی پہلو کی

---

[1] کریم الدین: طبقات الشعرا: صـ۲

جھلکیاں نمایاں ہوگئی ہیں۔ اسی تنقیدی پہلو سے اس زمانے کے معیار شعر و ادب کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ یہ تذکرے عام طور پر ان موضوعات پر علیحدہ روشنی نہیں ڈالتے۔

البتہ ایک تذکرہ ایسا ہے جس نے اس طرف توجہ کی ہے یہ تذکرہ مرزا قادر بخش صابر کا گلستانِ سخن ہے۔ اس میں ترتیب کا انداز روایتی ہے لیکن میرزا قادر بخش صابر نے شروع میں ایک طویل مقدمہ بھی لکھا ہے۔ جس میں حد شعر، عروض و قوافی کے فوائد اور اقسام نظم کا بھی ذکر آگیا ہے اور ان موضوعات پر انھوں نے تفصیل سے بحث کی ہے۔ اس سلسلے میں وہ کوئی نئی بات نہیں کہہ سکتے ہیں۔ انھوں نے انھیں باتوں کو دہرا دیا ہے جو معانی و بیان اور عروض پر لکھنے والوں کے قلم سے نکل چکی تھیں۔ لیکن چونکہ تذکرے میں علیحدہ انھوں نے اس موضوع پر قلم اٹھایا ہے، اس لئے اس کی اہمیت بڑھ گئی ہے۔ اس سے ان کے معیار شعر کا بھی اندازہ ہو جاتا ہے۔

میرزا قادر بخش صابر شعر و شاعری اور عروض و قافئے کے بارے میں لکھتے ہیں: "جاننا چاہئے کہ شعر لغت میں جاننے کو کہتے ہیں یعنی دانستن، اور اصطلاح میں کلام موزوں و مقفیٰ کو جو کہ شعر کی تعریف کے تین جزو ہیں..... کلام علم نحو کی اصطلاح میں اُن دو کلمہ یا زیادہ کا نام ہے کہ اسناد رکھتے ہوں یعنی ایسی نسبت کہ مخاطب کو بعد سکوت قائل کے فائدہ تامہ حاصل ہو جاوے اور اس کو مرکب مفید بھی کہتے ہیں جیسے زید قایم ہے لیکن تعریف مذکور میں یہ مراد نہیں بلکہ کلام سے متعلق الفاظ بامعنی مراد ہیں۔ اسناد پر مشتمل ہوں یا نہ ہوں۔ اسی واسطے بعضے اس تعریف میں بجائے کلام کے الفاظ بامعنی ایراد کرتے ہیں تاکہ مرکب غیر مفید بھی بشرط وزن و قافیہ شعر کی تعریف میں داخل رہے"[1] ہر چند کہ یہ باتیں اپنے اندر کوئی جدت نہیں رکھتیں۔ لیکن چونکہ ایک تذکرے کے دیباچے میں ان کا ذکر کیا گیا ہے اور ان سے شعر و شاعری کے فن پر کچھ روشنی

---

[1] میرزا قادر بخش صابر، گلستان سخن: ص ۴۷

پڑتی ہے اس لئے یہ اہم ہیں۔

گلستان سخن کے دیباچے میں قادر بخش صابر نے یہیں پر بس نہیں کیا ہے بلکہ آگے مل کر وہ دوہرے اور گیت وغیرہ کا بھی ذکر کرتے ہیں۔ اور ہندی، عربی اور فارسی عروض پر بھی روشنی ڈالتے ہیں۔ بلاغت کلام کا ذکر کرتے ہیں اور اردو کے اقسام نظم کا بھی تذکرہ کرتے ہیں[۱] اور ان بحثوں میں کہیں کہیں اصول تنقید کی جھلکیاں بھی مل جاتی ہیں۔ اسی وجہ سے ان کی اہمیت ہے۔

تذکروں کی تنقیدی اہمیت تذکروں کے متعلق یہ تمام باتیں اس حقیقت کو واضح کرتی ہیں کہ باوجود تاریخی ہونے کے یہ تذکرے اپنے اندر تنقیدی خصوصیات بھی رکھتے ہیں اور اگر ان کو سامنے رکھ کر دیکھا جائے تو کلیم الدین کا یہ خیال صحیح نہیں رہتا کہ "جس طرح اردو شعرا شاعری کی ماہیت، نظم کے مفہوم سے واقف نہیں تھے۔ اسی طرح یہ تذکرہ نویس تنقید کی ماہیت، اس کے مقصد، اس کے صحیح پیرائے سے آشنا نہ تھے۔ اس لئے ان تذکروں کی اہمیت محض تاریخی ہے۔ یہ دنیائے تنقید میں کوئی اہمیت نہیں رکھتے"[۲] یہ صحیح ہے کہ تذکرہ نویسوں نے تنقید کی ماہیت اور اس کے مقصد سے تذکروں میں بحث نہیں کی ہے۔ اس کی وجہ یہی ہے کہ اُن کا یہ میدان ہی نہیں تھا۔ لیکن انھوں نے کلام پر جو رائے دی ہے، اس سے یہ پتہ ضرور ملتا ہے کہ وہ تنقید کے مفہوم سے واقف تھے اور اس کا شعور بھی رکھتے تھے۔

البتہ ان کا میدان محدود تھا۔ اور ان کے معیار اس زمانے کے تنقیدی معیاروں سے مختلف تھے ڈاکٹر عبداللہ نے ٹھیک لکھا ہے کہ "جن لوگوں کے کان تنقید کے مفہوم سے آشنا ہیں، وہ اکثر خفا ہوتے ہیں کہ ہمارے اردو کے تذکروں میں تنقید کا نام نہیں لیکن وہ یہ نہیں سمجھتے کہ اس زمانے میں معائبیر تنقید کیا تھے؟ میر کے ذکر میں یہ بیان ہو چکا ہے کہ اس زمانے میں ادبی

---

[۱] میرزا قادر بخش صابر: گلستان سخن: صفحہ ۴۳ [۲] کلیم الدین احمد: اردو تنقید پر ایک نظر: صفحہ ۳۰

تنقید کا بڑا مقصد یہ تھا کہ زبان کو متروکات اور غیر فصیح الفاظ سے پاک کیا جائے اور اردو شاعری کو فارسی شاعری کے رتبے پر پہونچایا جائے۔ مجالس شعر و سخن حسن ذوق کی تربیت گاہیں تھیں۔ ان میں رد و قدح ہو جاتی تھی۔ پھر تذکروں کا نمبر آتا ہے۔ ان میں بھی زمانے کے معیار کے مطابق اصلاحِ سخن ہوتی رہتی تھی۔ آج جب ہم ان قدیم شعرا کے متعلق، مفصل اور مبسوط تنقیدوں کی تلاش کرتے ہیں تو ہمیں یقیناً مایوسی ہوتی ہے لیکن اس سلسلے میں سب سے بڑی رکاوٹ تذکرے کا ایجاز و اختصار تھا۔ اس لئے یہ بالکل درست ہے کہ ہمیں شعرا کے متعلق مفصل جزئیات نہیں ملتیں جس کے ذریعہ ہم اس کے کلام کی مجموعی خوبیوں سے آشنا ہو سکیں۔ نہ ہمیں وہ اسباب معلوم ہو سکتے ہیں۔ جن کی بنا پر تذکرہ نگاروں نے اپنی آرا قایم کیں۔ میر صاحب نہایت بے لاگ نقاد تھے۔ انھوں نے ریختہ کی تعریف اور اقسام دکن میں ریختہ، اصلاحِ شعر اور تنقید زبان تک اپنے آپ کو محدود رکھا ہے۔ لیکن جو کچھ لکھا ہے۔ بے لاگ لکھا ہے قایم نے ادوار کی تعین سے ناقدین کے لیئے قدرے سہولت پیدا کر دی ہے لیکن ان کی تنقیدیں بھی مختصر ہیں۔ افسوس ہے کہ جامع اور مفصل تذکروں میں تنقید کی اور بھی کمی ہے مجموعۂ نغز میں بقول پروفیسر شیرانی کہیں کہیں تنقیدی نقطۂ نظر کا آزادی سے استعمال کیا ہے۔ لیکن ایسا کرتے ہوئے اظہار رائے کا اختصار مدنظر رکھا گیا ہے۔ اس اختصار سے یہ غلط فہمی پیدا ہو جاتی ہے کہ قدیم تذکروں میں تنقید نہیں۔ حالانکہ آج بھی ہم مختلف شعرا کے متعلق جو رائے رکھتے ہیں وہ انہی تذکروں کے بعض اشارات پر مبنی ہے۔ وہ امور جو ان تذکروں سے دستیاب ہوتے ہیں یہ ہیں۔ مثلاً شاعر کس صنف میں اچھا کہتا ہے؟ اس کے کلام میں دردمندی کہاں تک ہے؟ زبان کی صفائی کا کہاں تک خیال رکھتا ہے؟ صاحب دیوان تھا یا نہیں؟ اس کے شاگرد کون کون سے ہیں؟ لوگ اس کی شاعری کے متعلق کیا رائے رکھتے ہیں؟ کون کون

لوگ اس کے مدمقابل تھے۔ وغیرہ وغیرہ۔ بعض تذکروں میں (مثلاً گلزار ابراہیم میں) شاعری کے مختلف شعبوں کا ارتقا بھی دکھایا ہے۔ پھر جب تذکرہ نویسی تاریخ ادب کی منزل میں داخل ہوگئی تو تنقید ذرا مفصل اور مشرح ہونے لگی۔ لیکن اس منزل میں پہونچ کر تذکرہ لغت نہ رہا کہ تاریخ بن گیا۔[1]

غرض یہ کہ ان تذکروں میں تنقید ہے لیکن اجمال کے ساتھ! معیار ہیں لیکن وہ آج کے معیاروں سے مختلف ہیں ان میں صرف تنقیدی روایات اور تنقیدی شعور کو تلاش کرنا چاہئے۔ تنقید کے مکمل اور بہترین نمونوں کا ڈھونڈنا بے سود ہے۔ آگے چل کر جب تذکرے نیا روپ اختیار کرتے ہیں اور ان کی شکل آبِ حیات اور گلِ رعنا کی ہوجاتی ہے تو اس میں تنقیدی پہلو زیادہ نمایاں ہوجاتا ہے۔ لیکن دراصل وہ تذکرے نہیں۔ بلکہ اردو شاعری کی تاریخیں ہیں اس لئے ان کی تنقیدی اہمیت کا ذکر اول تاریخوں کے تحت کرنا زیادہ مناسب ہے۔

[1] ڈاکٹر عبداللہ: شعرائے اردو کے تذکرے: مطبوعہ اردو اپریل ۱۹۴۲ء صفحہ ۲۱۵-۲۱۶

لغات القرآن مع فہرست الفاظ
جلد سوئم

لغتِ قرآن پر عدیم النظیر کتاب جس کی دو جلدیں شائع ہوکر مقبول ہوچکی ہیں، کتاب عوام و خواص، عربی داں، اردو خواں، جدید تعلیم یافتہ اور قدیم تعلیم یافتہ ہر ایک کے لئے مفید ہے اور تمام طبقوں میں اس کی افادی حیثیت کو تسلیم کرلیا گیا ہے قیمت غیر مجلد روپے مجلد پانچ روپے۔

ایک شعر پہ معذرت

پچھلے مہینہ کے برہان صفحہ ۸ پر فٹ نوٹ میں خاکسار راقم الحروف نے یہ شعر
نقل کیا تھا۔

سجدۂ تو برآورد از دل کافراں خروش — اے کہ دراز تر کنی پیش کساں نماز را

اقبال کا یہ شعر اور اس شعر کی پوری غزل مجھ کو اس وقت سے یاد ہے جب کہ میں دیوبند
میں طالب علم تھا۔ اس مدت میں میں نے یہ غزل بلامبالغہ سینکڑوں بار پڑھی ہوگی لیکن اس
شعر کا مطلب ہمیشہ میرے ذہن میں یہی رہا کہ شاعر ان لوگوں سے جو ایک حدیث کے لفظوں
میں اس طرح جلدی جلدی نماز پڑھتے ہیں کہ گویا کوئی مرغا زمین پر ٹھونگیں مار رہا ہے۔
(نقرالدیک) کہتا ہے کہ اے نمازی اگر تو اپنی نماز کو لوگوں کے سامنے دراز تر کردے یعنی خشوع
خضوع کے ساتھ نماز پڑھے تو اس نماز کا سجدہ اس درجہ ولولہ انگیز ہوگا کہ کافر بھی اس کو دیکھ
کر چیخ اٹھیں گے (یعنی مسلمان ہو جائیں گے)

میں شعر کا ہمیشہ یہی مطلب سمجھتا رہا اور کبھی ایک لمحہ کے لیے بھی یہ خیال نہیں ہوا
کہ اس کا مطلب کچھ اور بھی ہو سکتا ہے اور یہ ظاہر ہے کہ جس موقع پر میں نے یہ شعر نقل کیا ہے
اس کے سیاق وسباق کے ساتھ یہ اسی وقت منطبق ہو سکتا ہے جب کہ اس کا مطلب وہی
ہو جو میں نے اب تک سمجھ رکھا تھا۔ لیکن پچھلے دنوں دارالعلوم دیوبند کے شیخ الادب اور میرے
نہایت شفیق استاد مولانا محمد اعزاز علی صاحب نے جو برہان کا ایک ایک حرف۔ یہاں تک کہ

خود اپنے قول کے مطابق اس کے اشتہارات تک بڑی پابندی سے اور ناقدانہ حیثیت سے پڑھتے ہیں اپنے ایک والا نامہ میں تحریر فرمایا کہ اس شعر میں تو ریاکارانہ نماز پر زجر کیا گیا ہے اور مطلب یہ ہے کہ اے وہ شخص جو لوگوں کے سامنے طویل طویل نمازیں پڑھ رہا ہے تیرے سجدہ کا تو یہ عالم ہے کہ اسے دیکھ کر کافر بھی چیخ اٹھتے ہیں اسی مضمون کو اقبال نے ایک دوسری جگہ اس طرح بیان کیا ہے

گلہ جفائے وفا نما جو حرم کو اہل حرم سے ہے کسی بتکدہ میں بیاں کروں تو کہے صنم بھی ہری ہری

حضرت الاستاذ کے اس خط کو پڑھکر مجھکو یک بیک حیرت ضرور ہوئی کیونکہ میرے اپنے خیال میں اس شعر کا مطلب اس کے سوا کچھ اور ہو ہی نہیں سکتا تھا جو میں نے سمجھ رکھا تھا لیکن بعد میں دار المصنفین اعظم گڈھ کے بعض دوستوں سے اس کا ذکر آیا تو انھوں نے بھی صاف لفظوں میں جواب دیا کہ "اس شعر کا مطلب وہ ہی ہے جو مولانا اعزاز علی صاحب نے سمجھا ہے"

بہر حال اس داستان سرائی کا مقصد یہ ہے کہ اگر اس شعر میں واقعی ایک ریاکار نمازی کا خاکہ کھینچا گیا ہے جیسا کہ ان حضرات کی رائے ہے تو اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اس شعر کا اس موقع پر نقل کرنا پرلے درجے کا بے تکا پن ہے۔ اور میں اس کے لئے صدق دل سے معذرت خواہ ہوں!! سب سے زیادہ افسوس اس بات کا ہے کہ یہ بے تکا پن اُس وقت صادر ہوا جب کہ مولانا مدنی ایسی تقدس مآب شخصیت کا تذکرہ تھا۔ اعاذنا اللہ من زلۃ الاقلام وعثرۃ الافکار مثلھا۔

سعید احمد